ڈاکٹر شمع افروز
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو، جامعہ کراچی

جدید اردو نظم پر ثقافتی اثرات

ABSTRACT

Culturaln influences on modern Urdu poam
By Dr. Shama Afroz, Assistant Professor, Department of Urdu, University of Karachi.

Urdu poetry has progressed over the years and contains the grasp of civilization in sub-continent. In its all genres it has conveyed meanings not from the dictionaries but also surfaced the layers and merged them in between people of society. A brief and researched study of modern Urdu Poetry, especially Urdu Nazam tells us that how it took scars from Indian Civilization and proved its roots from other civilizations. This long journey of modern Urdu Nazam has been discussed in this article which also contains references of all modern Urdu poets such as Iqbal, Josh, Rashid, Faiz and Meera Ji through which the researcher has proved the said thesis of Civilizational contact and modern Urdu Nazam over decades.

ہر شاعری اپنے کی ترجمان ہوتی ہے اوراس پر تہذیبی و ثقافتی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔تہذیب کی تشکیل و تکمیل کا عمل صدیوں پر محیط ہوتا ہے ۔جب کہ ثقافت کا فروغ شعوری ادراک پر منحصر ہوتا ہے جب دو یا دو سے زائد انسانی گروہ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو ایک دوسرے کی ثقافت کو بھی اپنانے اور ایک دوسرے کی روایت کا احترام کرتے ہوئے شعوری طور پر اس کا اہتمام بھی کرتے ہیں ۔اوراس کے اثرات اس خطے میں کی جانے والی شاعری پر بھی ہوتا ہے۔حالی نے اپنی کتاب 'مقدمۂ شعر و شاعری' میں 'شاعری کے اثرات معاشرے پر' اور 'معاشرے کے اثرات شاعری پر' روشنی ڈالی ہے اور جدید اردو نظم بھی اس سے مبرا نہیں ہے۔جدید اردو نظم پر ثقافتی و تہذیبی اثرات بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔

جدید کے لغوی معنی ''نیا پن ہونا''[1] نیا اندازِ فکر اور نئی روش اختیار کرنا کے ہیں۔ جدید، ایک اصطلاح کے طور پر فنونِ لطیفہ، فلسفہ اور مذہب جیسے شعبوں میں بھی استعمال ہوتی ہے اور جدید کو قدیم کا ردِعمل بھی کہا جاتا ہے اور جدید نظم کا آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد شعوری طور پر بھی ہوا۔بقول خلیل الرحمٰن اعظمی کے:

اردو میں جدید نظم نگاری کا اصل محرک وہ تاثرات ہیں جو انگریزی زبان کی شاعری اور

نظم نگاری سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد محمد حسین آزاد اور حالی کے ذہن میں پیدا ہوئے۔ جب یہ دونوں حضرات پنجاب کے سررشتۂ تعلیم میں تراجم پر نظرِ ثانی اور درستگی کی خدمت پر مامور تھے۔(۲)

جدید اردو نظم روایتی موضوعات، اسالیب اور ہیئت سے انحراف اور نت نئے خیالات اور اندازِ بیان کو اپنے بطن میں سمو لینے کی بتدریج کوشش کر رہی تھی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی فرماتے ہیں:

درحقیقت جدید شاعری وہ شاعری ہے جو کسی انقلابی انداز سے بدلتے ہوئے ماحول کی صحیح ترجمانی میں خود اپنے آپ کو بدل دے۔ اس کے لیے روایت سے تھوڑی سی بغاوت ضروری ہے۔ تجربے کا ہاتھ بھی اس میں شامل ہونا یقینی ہے جو شاعری روایت کی بنی بنائی ڈگر سے تھوڑا ہٹ کر چلتی ہے اور جس کی رفتار میں تجربہ کا آہنگ ہوتا ہے اس کو ادبی اصطلاح میں جدید کہتے ہیں۔(۳)

''تہذیب'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں کسی درخت یا پودے کو'' کاٹنا، چھانٹنا اور تراشنا'' تاکہ اس میں نئی شاخیں نکلیں اور نئی کونپلیں پھوٹیں۔(۴)

تہذیب دراصل وسیع معانی کا حامل لفظ ہے۔ اس میں انسان کی زندگی کے بنیادی تصورات، عقائد و افکار، زندگی کا نصب العین اور تمام افعالِ ارادی جن میں انسان کا چلنا پھرنا، اندازِ گفتگو، کردار، اخلاق، آداب و اطوار، اس کے علم و ادبی، سائنسی اور ثقافتی کارنامے، اس کی سیاست، معاشرتی و سماجی و معاشی مسائل و وسائل سب کچھ شامل ہیں۔

تہذیب کے ساتھ کلچر کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ کلچر کا لفظ دوسرے متعدد الفاظ کی طرح انگریزی زبان سے اردو میں شامل ہوا۔ ہر چند کہ اس کے مترادفات کے طور پر ثقافت، تہذیب اور تمدن کے الفاظ بھی ادا کیے جاتے ہیں۔ لیکن کلچر کا جو مفہوم مغرب کے مفکرین نے اس کے مبادیات میں اور ماہرینِ سماجیات نے کلچر کی جو تعریف کی ہے ان میں کوئی لفظ بھی بھرپور نمائندگی نہیں کرتا۔ ثقافت کا لفظ بڑی حد تک کلچر کے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین کلچر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

کلچر انسان کا طریقِ زیست ہے، انسان فطرتاً صانع، عاقل اور ناطق ہے۔ اور کلچر اس کی اسی فطرت کا اظہار ہے۔(۵)

کلچر انسان کی اجتماعی زندگی کا مظہر ہوتا ہے۔ اور انسان ازمنہ قدیم سے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عادی رہا ہے۔ انسان کی زندگی میں سب سے اہم عوامل جبلتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں تحفظِ ذات، بھوک اور جنس کو بنیادی جبلتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پھر بود و باش کے لیے ابتداء میں درختوں سے نکل کر انسان مکانات کی تعمیر کی طرف مائل

ہوا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک علاقے میں رہنے والے گروہ کے استعمال میں آنے والے بیشتر اوزار، لباس، رہن سہن، رواج مشترک اور یکساں ہوتے ہیں۔ ان ہی مظاہر کو کسی مخصوص علاقے کے کلچر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ارتقاء کے ساتھ ساتھ زبان، رسم الخط، شاعری، داستان گوئی، موسیقی، عقائد جیسے شعبے بھی انسانی کلچر کا حصہ بنتے چلے گئے۔

انسان سماجی ارتقا کے طویل سفر میں دنیا کے اکثر خطوں میں جو تہذیب اور کلچر نمودار ہوئے وہ زیادہ تر جزیروں کی طرح ایک دوسرے سے بے خبر رہے۔ کیوں کہ ذرائع آمدورفت اور ترسیل و ابلاغ کے سلسلے بہت محدود ہوتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم معاشروں میں سیاحت اور محدود سطح پر تجارت کا رجحان تھا لیکن مختلف مما لک کے تہذیب و کلچر ایک دوسرے سے اس وقت زیادہ متعارف ہوئے جب انگلستان میں صنعتی انقلاب برپا ہوا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں مغرب کے بیشتر مما لک کا ایک نقطۂ اتحاد زیادہ نمایاں ہوا اور وہ تھا عیسائی مذہب۔

T. S. Eliot نے اپنی ایک کتاب *Note towards the definition of Culture* میں کلچر کو تین دائروں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ پہلا بڑا دائرہ عیسائیت کا۔

۲۔ دوسرا، اسی کے اندر ایک چھوٹا دائرہ مغربی کلچر کا۔

۳۔ تیسرا، پھر اس سے چھوٹا ایک دائرہ مقامی کلچر کا ہے۔

T. S. Eliot کے اس نقطۂ نظر کو رد اور قبول دونوں حصوں میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ عیسائیت کے مقابلے میں ہندومت اور بدھ مت بھی عالمی اثرات سے مزین ہیں۔ لہذا یہ ممکن نہیں کہ ساری دنیا کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک خطے میں صرف ایک مذہب کے ماننے والے رہتے ہوں۔

نو آبادیاتی نظام کی شکست کے زمانے میں تہذیب و کلچر کا مسئلہ بطورِ خاص زیرِ بحث آنے لگا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ایک زمانے تک بڑی فاتح اقوام نے دوسری اقوام کو اپنا نہ صرف غلام بنایا بلکہ اپنی تہذیب اور کلچر بھی ان کے لیے لازمی قرار دے دیا۔ یہ عمل شعوری طور پر ہوا۔ جس کا اندازہ لارڈ میکالے کے تعلیمی نظریات سے اچھی طرح سے ہوسکتا ہے کہ ہندوستانی رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں گے۔ لیکن زبان، لباس، رہن سہن، طرزِ زندگی غرض ہر لحاظ سے انگریزوں جیسے ہوں گے۔ گویا جب کوئی ترقی یافتہ کلچر اور تہذیب فاتح بن کر آتی ہے تو مفتوح کی تہذیب اور کلچر خارجی دباؤ کی وجہ سے سکڑ جاتے ہیں۔

جغرافیائی اور تاریخی تناظر میں اپنی تہذیب اور کلچر کا مطالعہ کیا جائے تو ان ہی جغرافیائی حدود میں وادیِ سندھ کی تہذیب سب سے قدیم ہے[۶] اور اس میں موہن جو داڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا جیسے آثار اس کی قدامت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ تاریخی اعتبار سے موہن جو داڑو کی تہذیب پر آریاؤں کے وسط ایشیا سے وادیِ سندھ کی طرف آنے کا عمل شامل ہے۔ آریا اپنے ساتھ جو تہذیب و کلچر لاتے تھے اور جن مظاہر کو انھوں نے ماقبل مسیح برصغیر میں متعارف کرایا، ان میں سنسکرت

زبان، چہار وید (رگ وید، سام وید، یجر وید اور اتھر وید)، ذات پات کا نظام (برہمن، کھتری، ویش اور شودر)، عبادات جن میں بھجن اور مذہبی گیت شامل ہیں۔ آریائی تہذیب و کلچر کے ساتھ مل کر ایک نئی تہذیب اور کلچر کی بنیاد ڈال دی۔ اس کے بعد دنیا کے دیگر خطوں میں بھی مختلف باشندے سیاحت اور تجارت کی غرض سے برصغیر آتے رہے۔ ان میں ایک اہم پیش رفت پہلے محمد بن قاسم کی فتح سندھ اور پھر محمود غزنوی کی برصغیر میں آمد سے ہوئی۔

مسلمانوں کی آمد سے عقائد اور عبادات کے علاوہ فنِ تعمیر نے بھی برصغیر کے منظر نامے کو تبدیل کر دیا۔ کیوں کہ مسلمانوں سے قبل یہاں کی عمارتوں میں گنبد، مینار اور محراب جیسی تعمیری اختراعات نہیں ہوتی تھیں۔ اسی طرح مغل بادشاہ بابر نے جب دیکھا کہ برصغیر کی عورتیں اور مرد دھوتی باندھتے ہیں تو تزکِ بابری میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ یہ بغیر سلے کپڑے کس طرح پہنتے ہیں اور ننگے پاؤں پھرتے ہیں،(۷) گویا عبا، قبا، شلوار اور دیگر سلے ہوئے لباس مسلمانوں کی آمد سے برصغیر میں متعارف ہوئے۔ اسی طرح کھانے پینے کی اشیاء اور خورنوش وغیرہ۔

غرض مسلمانوں کے اثرات جہاں ہندو آبادی نے قبول کیے وہیں ہندوؤں کی تہذیب و کلچر کے متعدد عناصر مسلم تہذیب و کلچر میں شامل ہو گئے۔ اس طرح صدیوں کی مسافت میں ایک مشترک تہذیب اور کلچر معرضِ وجود میں آ گیا۔ اور انگریزوں کی آمد نے بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹ ویں صدی کے آخر میں تقریباً تین دہائیوں کی شاعری میں انگریزی الفاظ اپنے عصر کے خط و خال کو عریاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دراصل کسی بھی زبان کا کوئی ایک لفظ بھی کسی دوسری زبان میں شامل ہوتا ہے تو اپنے ساتھ اپنی تہذیب، کلچر، ثقافت بھی اپنے ساتھ لاتا ہے۔ حالی، شبلی، اسمٰعیل میرٹھی، نادر کاکوروی، شرر، نظم طبا طبائی اور بالخصوص اکبر الہ آبادی نے انگریزی الفاظ کو انگریزی تہذیب اور کلچر پر گہرے طنز اور اپنی تہذیب کی خستہ حالی کے ساتھ معاشرتی انحطاط کی صورت میں پیش کیا ہے۔ انگریزی زبان کا عمل دخل اور روزمرہ میں اس کا بڑھتا ہوا استعمال ہی تھا۔ جس کے باعث اس عہد کی نظموں میں زبان کی تبدیلی خصوصی طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ اکبر کا تہذیبی طنز ملاحظہ کیجیے کہ:

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا(۸)

جدید نظموں کا تہذیبی مطالعہ کرتے ہوئے اس پر غور و فکر کریں تو یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ اس کے بنیادی تصورات کس حد تک ہندوستانی ذہن، مزاج اور اس کی روح سے ہم آہنگ ہیں۔ جہاں تک شعری اصناف کا تعلق ہے تو اسے انگریزی، فارسی، فرانسیسی، جاپانی زبان و ادب وغیرہ سے مستعار لیا گیا ہے اور اس ضمن میں کوئی بہت بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مقامی اثرات بھی اس نے کسی حد تک قبول کیے۔ اس لیے عصرِ حاضر میں مقامی و غیر مقامی اثرات ہم آمیز نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ:

یہ درست ہے کہ اردو شاعری نے ہندوستانی دیومالا کو بہت کم منہ لگایا اور وہ ہندی تلمیحوں کا ذکر ایسی سہولت اور اعتماد سے نہیں کرتے جیسے عربی یا ایرانی تلمیحات کا ذکر کرتے ہیں۔(۹)

یہ صحیح ہے کہ ہماری شاعری میں ایرانی و عربی تہذیب کا گہرا شعور جا بجا ملتا ہے لیکن اس موقع پر میرا جی کی نظموں پر ایک نظر ڈالیں تو ہندو متھ کا گہرا شعور، اس کی تہذیب اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔

شری رام چندر

انھیں وشنو کا ساتواں اوتار مانا گیا ہے۔حسن و جمال سے بہرہ ور اور سپہ گری، تیر اندازی اور شہ سواری میں طاق تھے۔ سیتا کو انہوں نے سوئمبر میں پرس رام کی کمان توڑ کر حاصل کیا تھا۔ ان تمام عناصر کو میرا جی کی نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔جن میں تہذیبی قوت، اطاعت، فرماں برادری، خوش خلقی، وفا شعاری، رحم دلی اور سماجی اوصاف، راست گوئی وغیرہ لیے ہوتی ہے۔گویا شری رام صرف کردار نہیں ہے بلکہ ہند مالائی اور اس کی تہذیبی علامت کے طور پر بھی میرا جی نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔

کرشن، رادھا اور گوپیاں

ہندو اوتاروں کے نعرے میں شری کرشن عموماً اپنے رومانی کردار، سانولے پن اور بانسری کی دھن سے پہچانے جاتے ہیں۔ گوبند، گوپال، گوردھن اور گردھاری کے نام شری کرشن کے مختلف رخ کو ظاہر کرتے ہیں جو میرا جی کی شاعری میں ملتے ہیں۔ میرا جی نے ہندی شاعری سے بالخصوص استفادہ کیا۔ علامات، تلمیحات و کنایات ہندوی شاعری سے لے کر اسے اردو شاعری میں جذب کر دیا گویا ایک تہذیب کو پھر سے زندہ کر دیا۔

راشد کی شعری کائنات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی شاعری کا مرکز و محور بھی مشرق اور اس کی روح ہے۔راشد اور میرا جی دونوں اپنے زمانے کے باغی شعرا کہلائے۔راشد کے یہاں جنس کے رجحان، استعمار کے خلاف اظہار اور خدا سے بغاوت شامل ہیں۔لیکن وہ ہند اسلامی تہذیب کا پروردہ دکھائی دیتا ہے۔جس میں جغرافیائی اور ثقافتی محرکات کارفرما نظر آتے ہیں۔

راشد کی شاعری سیاسی بصیرت بھی رکھتی ہے اور اپنی تہذیب کا شعور بھی رکھتی ہے جس کو انھوں نے عالمی تناظر میں ہونے والی تبدیلی، اپنے اقدار کی ٹوٹ پھوٹ اور استحصال کو ایک نئے لب و لہجے میں اپنی نظموں میں پیش کرنے کی سعی کی۔مثلاً 'مینار' اسلامی فنِ تعمیر سے تعلق رکھتا ہے۔'ہمہ اوست'، 'نمرود کی خدائی'، 'سبا ویراں'، 'اسرافیل کی موت'، 'من و سلویٰ'

وغیرہ۔

جاگ اے شمع شبستان وصال
محفل خواب کے اس فرش طرب ناک سے جاگ
لذت شب سے ترا جسم ابھی چور سہی
آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوار سحر چومتے ہیں
مسجد شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے(۱۰)

(دریچے کے قریب)

راشد کی نظم 'حسن کوزہ گر' صرف راشد کی نہیں بلکہ اردو کی بھی شاہکار نظموں میں سے ہے۔ 'حسن کوزہ گر' کے چاروں حصوں کو ملا کر پڑھنے سے راشد کے جہانِ خیال و معنی ایک مرتب شدہ دستاویز کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس میں عشق کا استعارہ اپنی تفہیم کے لیے مشرق کی تہذیبی روایت کے گہرے شعور کا تقاضا کرتا ہے۔ زمان و مکاں کے دائرہ میں وجودِ انسانی کی معنویت آشکار ہوتی ہے۔

جہاں زاد، نیچے گلی میں ترے در کے آگے
یہ میں سوختہ سر حسن کوزہ گر ہوں
تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار یوسف
کی دکان پر میں نے دیکھا
تو تیری نگاہوں میں وہ تاب نا کی
تھی، میں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ
پھرتا رہا ہوں۔
جہاں زاد، نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں
یہ وہ دور تھا جس میں، میں نے
کبھی اپنے رنجور کوزوں کی جانب
پلٹ کر نہ دیکھا(۱۱)

چند مصرعے 'حسن کوزہ گر' کے دوسرے حصے سے ملاحظہ کیجیے: جس سے مشرقی تہذیب اور عشق توسط سے ذات اور اس کا باطن و آگہی کا راز عیاں ہوتا ہے۔ ن م راشد کی نظم 'حسن کوزہ گر' کے چاروں اجزا علحدہ علیحدہ ہوتے ہوئے بھی فکری لحاظ سے ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ جو مشرق کی تہذیبی تاریخ کا شعور بھی بخوبی رکھتی ہے۔

اے جہاں زاد
ہے ہر عشق سوال ایسا کہ عاشق کے سوا
اس کا نہیں کوئی جواب
یہی کافی ہے کہ باطن کی صدا گونج اٹھے(۱۲)

اقبالؔ نے اسلامی تہذیب کو جس طرح سے اپنی شاعری میں زندہ کیا ہے، اس طور نہ اس سے قبل اور نہ ہی ان کے بعد کوئی اس لب و لہجہ میں پیش کر سکا ہے۔ اقبال کی نظموں میں ایک ایسی کائنات ہے جس کا مطالعہ تہذیب کی تاریخ، اس کا پس منظر، اپنے عہد کی آگہی کا پردہ چاک کرتی ہے۔ یہ ایک فکری شاعری ہے جس میں فلسفہ مضمر ہے۔ لہذا اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے بھی اسلامی تہذیب کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ اقبال کی نظموں میں مثلاً مسجد قرطبہ، سوامی رام تیرتھ، نانک، دریوزۂ خلافت، وغیرہ۔

مسجد قرطبہ کے چند مصرعے ملاحظہ کیجیے:

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خون جگر، سل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود(۱۳)

جوشؔ ملیح آبادی نظم کا ایک اہم شاعر ہے جس کے موضوعات بہت وسیع ہیں اور اظہار کے مختلف رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ استفسار اور احتجاج کے کئی روپ نظر آتے ہیں۔ مشرقی تہذیب کا تصورِ عشق بھی ملتا ہے اور فارسی شعر و ادب کا گہرا شعور بھی جھلکتا ہے۔ ان کی شاعری پر مغرب کے تصورات کا اثر یقیناً ہے لیکن جوشؔ اپنی تہذیب سے خود آشنا تھے۔

'گنگا کے گھاٹ'

بڑھائے سرمئی عارض ہوائے صحرا سے
نہایا کون چلا آ رہا ہے گنگا سے
سرادلائی کا سر پر نظر جھکائے ہوئے
دبائے دانتوں میں آنچل، بدن چرائے ہوئے(۱۴)

فیض احمد فیضؔ کی نظموں میں ہماری شعری روایت کا گہرا شعور موجود ہے بلکہ تہذیب و ثقافت کو اپنے پورے رچاؤ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فیضؔ نے غم، دکھ، جبر اور ستم سے اپنی نظموں میں حیات تازہ کی آبیاری کی ہے۔ نشاط کا پہلو اجاگر کیا ہے۔ جس سے افسردگی اور غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی(۱۵)

روزنِ زنداں، مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی، وغیرہ ہماری تہذیب اور ثقافت کی عکاسی کر رہی ہیں۔ مانگ ستاروں سے بھر جانے کا مطلب خوشیوں کے لمحات کا آنا بھی ہے

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں(۱۶)

'لیلائے وطن' کہنا عرب کی تہذیب سے جڑ کر جو ہماری تہذیب میں ضم ہو چکی ہے، وغیرہ۔

ہماری اردو شاعری میں گیت کو ابتداء سے ہی تہذیبی اور ثقافتی اہمیت حاصل ہے اور جدید شعرا نے بھی اس گیت کی روایت میں جدت پیدا کی ہے۔ گیت چوں کہ کسی مخصوص شعری ہیئت میں نہیں لکھے جاتے ہیں لیکن گیت اپنا ایک خاص مزاج رکھتا ہے جس میں عاشق عورت ہوتی ہے اور معشوق مرد ہوتا ہے لہذا گیت کا لب و لہجہ بھی اپنی تیئں میں منفرد ہوتا ہے۔ گیت کے موضوعات میں اتنی وسعت ہے جتنی کہ انسانی جذبات و احساسات جڑے مختلف اسباب و عوامل زندگی ہیں۔ اس طرح گیت میں موضوعات کی کوئی قید نہیں ہے۔ گیت کا خاص ردھم اس کی لفظیات سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ اور یوں گیت اپنی مربوط صورت میں سامنے آتا ہے۔ امیر خسرو نے تو گیت اور گیت نگاری کے ضمن میں راگ کے ملاپ کو اختراعی انداز میں پیش کیا تھا۔ جدید شعرا نے حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، میراجی، قیوم نظر، سلام مچھلی شہری، جمیل الدین عالی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ حفیظ جالندھری کے مجموعۂ کلام سوز و ساز سے گیت ملاحظہ کیجیے:

اب شام ہو چلی ہے اب چھا چل اندھیرا

دنیا میں آسماں نے صبر و سکوں بکھیرا
اور دامن شفق پر سرخی نے رنگ پھیرا(۱۷)

حواشی

(۱) سیّد احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، جلد دوم، (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۷۴ء)، ص۔ ۶۵
(۲) ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ (تشکیلی دور) (۱۴ تا ۳۶) مشمولہ سوغات، بنگلور، جدید نظم نمبر، ۱۹۶۷ء، ص ۸۶
(۳) ڈاکٹر عبادت بریلوی، جدید اردو شاعری مشمولہ نگار، کراچی، جدید شاعری نمبر، ۱۹۶۵ء، ص ۱۱
(۴) پروفیسر ڈاکٹر ساجد امجد، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۱
(۵) ممتاز حسین، ادب اور شعور، (کراچی: ادارہ نقدِ ادب، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۸۸
(۶) ڈاکٹر شاہدہ بیگم، سندھ میں اردو، (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۰ء)، ص ۲۸
(۷) میرزا نصیر الدین حیدر، اردو ترجمہ تزکِ بابری معروفہ بابر نامہ، (دہلی: مطبع محمڈن پرنٹنگ ورکس، ۱۹۲۴ء)، ص ۲۹۰
(۸) اکبر الٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، (کراچی: فرینڈز پبلشرز، سنہ ندارد)، ص ۹۸
(۹) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری، (دہلی: قومی کونسل برائے اردو زبان، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۲۹
(۱۰) ن م راشد، کلیاتِ راشد، (لاہور: ماورا پبلشرز، سنہ ندارد)، ص ۹۷
(۱۱) ایضاً، ص ۲۵۳
(۱۲) ایضاً، ص ۴۴۸
(۱۳) علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، (لاہور: دی کو لیکشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۷۵۔ ۷۶
(۱۴) ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی، مرتب، جوش کی تیرہ نظمیں، (اورنگ آباد: سویرا آفس پرنٹرس، ۲۰۰۳ء)، ص ۳۳
(۱۵) فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، (لاہور: مکتبۂ کارواں، سنہ ندارد)، ص ۶۲
(۱۶) ایضاً، ص ۱۶۱
(۱۷) حفیظ جالندھری، کلیاتِ حفیظ جالندھری، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۲۹۵

مآخذ

(۱) امجد، پروفیسر ڈاکٹر ساجد، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء
(۲) اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال، لاہور: دی کو لیکشنز، ۲۰۰۴ء
(۳) الٰہ آبادی، اکبر، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، کراچی: فرینڈز پبلشرز، سنہ ندارد
(۴) بیگم، ڈاکٹر شاہدہ، سندھ میں اردو، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۰ء

(۵) جالندھری، حفیظ، کلیاتِ حفیظ جالندھری، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
(۶) حسین، ممتاز، ادب اور شعور، کراچی: ادارہ نقدِ ادب، ۱۹۹۲ء
(۷) حیدر، میرزا نصیر الدین، اردو ترجمہ تزکِ بابری معروفہ بابر نامہ، دہلی: مطبع محمڈن پرنٹنگ ورکس، ۱۹۲۴ء
(۸) راشد، ن م، کلیاتِ راشد، لاہور: ماورا پبلشرز، سنہ ندارد
(۹) صدیقی، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن، مرتب، جوش کی تیرہ نظمیں، اورنگ آباد: سویرا آفس پرنٹرس، ۲۰۰۳ء
(۱۰) فیض، فیض احمد، نسخہ ہائے وفا، لاہور: مکتبۂ کارواں، سنہ ندارد
(۱۱) نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، دہلی: قومی کونسل برائے اردو زبان، ۲۰۰۳ء

رسائل و جرائد

(۱) اعظمی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن، اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ (تشکیلی دور) (۱۴ تا ۳۶) مشمولہ سوغات، بنگلور، جدید نظم نمبر، ۱۹۶۷ء
(۲) بریلوی، ڈاکٹر عبادت، جدید اردو شاعری مشمولہ نگار، کراچی، جدید شاعری نمبر، ۱۹۶۵ء

لغت

(۱) دہلوی، سیّد احمد، فرہنگِ آصفیہ، جلد دوم، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۷۴ء